اقبالیاتی ادب

علمی مجلّات کے مقالات کا تعارف

نبیلہ شیخ

ڈاکٹر محمد اقبال شاہد: ''علامہ اقبال اور قدیم ایرانی مذاہب''، قومی زبان، فروری ۲۰۰۷ء، ص ۳۵-۳۹۔

اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے حصہ اوّل کو ایرانی دوگرائی (دو خداؤں کا تصور) سے موسوم کیا ہے۔ ایرانی اساطیر کے مطابق ''اورمز'' نیکی کا اور ''اہرمن'' بدی کا خدا ہے۔ اقبال کے مطابق ظہور زرتشت کے زمانے میں قدیم ایرانی دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک نیکی اور خوبی کی ذاتی قوتوں کے پیروکار، دوسرے بدی اور بیگانہ قوتوں کے طرف دار۔ زرتشت نے بھی اپنے مذہبی فلسفے کی بنیاد انھی دو قوتوں پر رکھی اور بری قوتوں کو نیک خدا کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں مشغول ہوگیا۔ اقبال اسے زرتشت کی مجاہدت نارسایا بے فائدہ سعی کا نام دیتا ہے۔ اقبال اپنے آثار میں زرتشت کی نمایندہ روشنی اور شیطان کے خلاف برسرپیکار مبارز، شاعر اور پیامبر ایران کے ناموں سے تعریف کرتا ہے۔

مانی زرتشت کے برعکس ثنویت (دوگانہ خدا کے تصور) کو مادی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے خیال میں نیکی اور بدی کی آمیزش اصل جہان ہے۔ نور اور ظلمت ایک دوسرے سے جدا اور مستقل وجود کی حامل قوتیں ہیں۔ نور کے دس خواص ہیں: حلم، معرفت، فہم، علم خفی، بینش، عشق، ایقان، ایمان، نیک خواہی اور عقل جبکہ ظلمت کے پانچ خواص ہیں: دھند، دھواں، آگ، آندھی اور اندھیرا۔ اقبال کے نزدیک مانی کی یہ تعبیر بچگانہ ہے۔ لیکن تاریخ فلسفہ میں مانی کا ایک منفرد مقام ہے اور وہ پہلا حکیم ہے جس نے شیطان کو فعالیت کا سبب اور فطرتاً برا (بد) کہا ہے۔ اقبال کے منثور و منظوم آثار میں مشہور کمیونسٹ مزدک کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جس نے انسانی برابری اور مساوات کا پرچار کیا۔ اقبال کے نزدیک مزدک اپنے فکری نظام میں زیادہ حساس ہے اور اس کی تعلیمات کا نمایاں ترین پہلو اس کا انسان سے رابطہ اور اس کا احساس اور خیال رکھنا ہے۔ اقبال مزدک کے درسِ مساوات کو پسند کرتا ہے لیکن رستخیز کے بغیر ایمان و ایقان کو جدال محض سے تعبیر کرتا ہے آخر میں اقبال مذکورہ قدیم ایرانی مذہبی فکر و فلسفہ کا تجزیہ یوں کرتا ہے۔ ایرانیوں کا نمایاں

ترین امتیاز ان کی فلسفیانہ عقل پسندی ہے۔لیکن ایسا لگتا ہے کہ ایرانی ذہن فکری حقائق کے سلسلہ میں بے صبر واقع ہوا ہے اور کلی طور پر پراگندہ حقائق کے مشاہدہ کی طاقت وتوانائی کا حامل نہیں۔نازک خیال ہندی برہمن وحدت کلی کو زندگی کی تمام جزوی آزمائشوں میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انھیں جہان کے گوناں گوں مظاہر میں منعکس پاتا ہے جبکہ ایرانی فلسفے کی مثبت خدمت کو غزالی کی چھوٹی سی کتاب مشکوۃ الانوار میں دیکھا جاسکتا ہے۔غزالی نے اس کتاب کا آغاز قرآن کی آیت سے کیا ہے:''اللہ ہی آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔''اس کے بعد غزالی نے کہا ہے جہان ظلمت سے پیدا ہوا لیکن اللہ نے اس پر اپنا نور ڈال دیا۔اقبال اپنے آثار میں وحدت خداوندی کے بعد رسالت کو بنیادی رکن اور راہِ حق کے لیے روشن مشعل قرار دیتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر:''اقبال کہانی''،اخبار اُردو،اسلام آباد،اپریل ۲۰۰۷ء،ص۸۰۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نوجوان نسل کے شاعر ہیں۔وہ عظیم شاعر جو اس دنیا میں تبدیلی اور انقلاب کا سرچشمہ نوجوانوں کو سمجھتے تھے۔وہ چاہتے تھے کہ مسلم نوجوان بھی شاہین کی طرح جھپٹنا، پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا سیکھ لیں۔'اقبال کہانی' بھی مصنف ڈاکٹر افتخار کھوکھر کی ایسی ہی کاوش ہے جس میں انھوں نے اقبال کے افکار وخیالات کو کہانی کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

☆☆☆

سیّد طارق رضوی:''عصر حاضر اور بصیرت اقبال''،افکارِ معلم،لاہور،جنوری ۲۰۰۷ء،ص۴۰-۴۴۔

بیسویں صدی میں دنیائے اسلام کے فکری اُفق پر جو نام بہت منفرد اور ممتاز نظر آتا ہے وہ حکیم الامت علامہ اقبال کا ہے۔ان کی عہد ساز شاعری ہمارے اجتماعی شعور کی صورت گر ہے اور اس میں مستقبل کی پیش گوئی کی غیر معمولی صلاحیت کی حامل ہے۔مذہبی،تاریخی اور تہذیبی حوالے سے اقبال کی فکر کا سب سے اہم پہلو مغرب پر تنقید ہے۔اقبال نے مغربی تہذیب کے کمزور پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے اسلامی تہذیب اور اسلامی تصورات کی برتری کو نہایت مدلل انداز میں پیش کیا۔

اقبال کا دور کشمکش کا دور تھا،تحریک حریت اور استقلال کا دور تھا۔اقبال کو خدا نے بصارت کے ساتھ بصیرت بھی دی تھی۔وہ مرد مسلمان تھے۔تدبر کے ساتھ انھیں فراست مومنانہ بھی عطا ہوئی تھی۔وہ مستقبل کے مناظر کو دیکھ رہے تھے،انھیں معلوم تھا یہ دور استعمار ختم ہوگا۔اقبال کی شاعری کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کے ہاں عقل اور دل یا خرد اور عشق کے درمیان تضاد کا تذکرہ دراصل مغربی تہذیب کی مذمت اور تنقید سے تعلق رکھتا ہے۔اقبال نے اپنی پوری تخلیقی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے عشق اور دل کو اسلامی تہذیب کے استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔

اقبال نے اُمت مسلمہ کے بارے میں اور مغربی تہذیب کے مستقبل کے بارے میں جو پیش گوئیاں کی ہیں ان میں سے بہت سی پوری ہوچکی ہیں۔ اُمت مسلمہ کے روشن مستقبل کا تذکرہ وہ اپنے کلام میں نہایت یقین سے کرتے ہیں اور اپنے ایمانی جذبے کی سرشاری سے وہ سب کو سرشار کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر جاوید اقبال: ''اقبال ایک باپ کی حیثیت سے''، تہذیب الاخلاق، لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء، ص۱۱-۱۹۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ مقالہ علامہ اقبال کی گھریلو اور خاندانی زندگی کے کچھ گوشوں کو بیان کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں علامہ نے مجھے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا موقع دیا ہوگا جس میں ان کی شفقت یا اس الفت کا اندازہ لگا سکتا، جو انھیں میری ذات سے تھی۔ والدین اکثر بچوں کو پیار کرتے ہیں، انھیں گلے لگاتے ہیں، انھیں چومتے ہیں مگر مجھے ان سے کبھی اسی قسم کی شفقت پدری کا احساس نہ ہوا۔ ان کی محبت کے اظہار میں ایک اپنی طرز کی خاموشی تھی جس میں عنفوان شباب کے وقتی ہیجان کا فقدان تھا۔ اس محبت کی نوعیت فکری اور تخیلی تھی جس تک پہنچنے کی اہلیت میرا ذہن نارسا نہیں رکھتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میں ان کے بڑھاپے کی اولاد تھا۔ بہرحال جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ان سے محبت کرنے کی بجائے خوف زیادہ کھاتا تھا۔

جاوید اقبال صاحب نے زیرنظر مقالے میں اپنے بچپن اور لڑکپن میں پیش آنے والے واقعات اور اپنے والد سے وابستہ توقعات اور محسوسات کو پیش کیا ہے۔

☆☆☆

فضل حسین قلیل: ''فقر نگاہِ اقبال میں''، تہذیب الاخلاق، لاہور اپریل ۲۰۰۷ء، ص۲۵-۲۷۔

فقر، وہ فقر نہیں جو ترک دُنیا کی ترغیب دیتا ہے۔ فقر کا پہلا مطالعہ نفس سے جہاد ہے۔ نفس کو تابع فرمان رکھ کر دنیا کے غیر ضروری، منفی اور راہ سلوک سے بھٹکانے والے مظاہرے سے دامن کش ہوکر رہنا۔

اقبال شیخ نور محمد جیسے درویش خدامست کی آغوش پدری کے پروردہ تھے جنھوں نے دور طفولیت میں ہی اقبال کے تحت الشعور میں روحانی اقدار کے احساسات کو مستحکم کر دیا تھا۔ پھر اقبال کو حضرت میر حسن جیسے دانا، بینا اور صاحبِ سخن دلنواز استاد میسر آئے۔ جنھوں نے اقبال کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور اقبال کی خداداد صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ علامہ کو دانشور کہلانے والے تو کثرت سے ملتے رہے لیکن ان کو حقیقی فقر کی وہ نگاہ کہیں نظر نہ آئی جس کی عمیق توجہ ان کے قلب و نظر کے اضطراب کو دائمی سکون سے آشنا کر سکتی۔ علامہ فرماتے ہیں وہ فقر صالح، جس کے عمل سے قم باذن اللہ کے بطن سے کرامات و معجزات کے سوتے اُبلتے تھے، جس کے آستین سے ظہور پذیر ہونے والے ید بیضا سے کلیمانہ تجلیات کی

خیرہ کن کرنیں پھوٹتی تھیں نایاب ہے۔ بے شک ایسے خرقہ پوش اور بوریہ نشین صاحبِ فقر کے حضور تالیف قلب کے لیے سرِتسلیم کرنا واجب ہے۔ یہ وہ گہرہائے نایاب ہیں جو شاہانِ عالم کو نصیب نہیں۔

☆☆☆

خواجہ محمد زکریا: ''علامہ اقبال اور ہمارے مسائل''، ادب دوست، لاہور جنوری، ۲۰۰۷ء، ص ۸-۱۱۔

علامہ اقبال نے تقدیر پرستی کو مسلمانوں کے زوال کا بنیادی سبب قرار دیا ہے۔ تقدیر پرستی پر یقین رکھنے کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا کہ روزِ ازل لوح محفوظ پر جو کچھ لکھ دیا گیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا اس لیے ہمیں جستجو کرنے کی ضرورت نہیں۔ مسلمان فلسفیوں اور متکلموں نے یہاں تک لکھا ہے کہ انسان کو اتنا متوکل ہونا چاہیے جتنا کہ مردہ ہوتا ہے جو غسال کی کوشش سے حرکت کرتا ہے۔ قوم کا اجتماعی عقیدہ یہ ہے کہ دُعا سے قضا بدل جاتی ہے۔ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے۔ محنت سے جی چرانے اور ہر شعبے میں کوشش اور جستجو سے کام نہ لینے کی وجہ سے ہم علوم جدید میں کئی نسلیں پیچھے رہ گئے ہیں۔

اقبال کے افکار میں نہایت قیمتی جوہر نظریہ اجتہاد ہے۔ قرآن مجید نے نظام چلانے کے لیے رہنما اصول دیے ہیں جن کی روشنی میں ہر دور میں پیدا ہونے والے نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ضروری ہے۔ اقبال کو ادراک تھا کہ اسلام ایک حرکی مذہب ہے نہ کہ سنگ بستہ اور جامد۔ اگر اس میں لچک نہ ہوتی تو اب تک یہ مٹ چکا ہوتا۔ آپ نے اپنی عمر عزیز کے آخری دس بارہ سال اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت پر غور کیا اور کئی معاملات میں اجتہاد کے لیے جدوجہد کی۔ اب ہمارے بہت سارے مسائل اجتہاد کا تقاضا کرتے ہیں۔ مثلاً رویت ہلال، سود کا مسئلہ اور انشورنس وغیرہ۔ اقبال نے کم از کم اس بات کا ادراک تو کیا کہ نیا زمانہ بہت سے نئے مسائل لے کر سامنے آئے گا جن کے لیے مسلمانوں کو اجتماعی طور پر کوئی لائحہ عمل اپنانا ہوگا۔ اقبال نے ان مسائل کے حل کے لیے اپنی سوچ کو کبھی حرف آخر قرار نہیں دیا بلکہ اس بات کا صاف صاف لفظوں میں اقرار کیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید حل سامنے آئیں گے اور وہ بہتر حل ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

ادارہ: ''اقبال کی صحبت میں'' قومی ڈائجسٹ، لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۹۴-۱۰۰۔

علامہ اقبال کی مجلس میں بیٹھنے والے چند مشاہیر کی دل افروز یادیں بیان کی گئی۔ یہ عام قاری کے لیے دلچسپ ہیں اور اقبال کے افکار اور ذاتی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں۔ ان مشاہیر میں شیخ عبدالقادر، سراج نظامی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر تاثیر اور فقیر سید وحیدالدین شامل ہیں۔

فقیر سید وحیدالدین بیان کرتے ہیں کہ میں نے زمانے کی قدر ناشناسی کا ذکر کیا اور کہا لوگ شاعروں کی قدر نہیں کرتے تو ڈاکٹر صاحب نے کسی قدر تامل کے بعد فرمایا تم غور کرو تو معلوم ہوگا کہ جب شاعر کی

آنکھیں کھلی ہوتی ہے تو دنیا کی بند ہوجاتی ہیں اور جب شاعر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوجاتی ہیں تو دنیا کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور وہ صدیوں تک اس کی تعریف وتوصیف کے گیت گاتی رہتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کیا یہ صحیح ہے کہ انسان بغاوت کا دوسرا نام ہے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا بالکل صحیح۔ آخر تم ہی کہو تم نے اپنے والدین کے احکام کی تعمیل کہاں تک کی ہے۔ کیا تم میں سرکشی کی روح نہیں میں نے شرمندہ ہوکر نگاہیں جھکالیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر نصرت جہان: ''تاثیر رومی در افکارِ اقبال''، دانش، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۷۷-۸۴۔

رومی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، ان کے افکار تمام جہاں کے لیے درخشندہ اور ان کی تعلیمات نژادِ نو کے لیے مشعل راہ ہے۔ فارسی زبان میں مثنوی معنوی کو قرآن پہلوی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اقبال نے ہمیشہ مولوی کو مرشد یا پیر کے نام سے یاد کیا اور ان کے کلام کے اثرات اقبال کے کلام میں موجود ہیں۔ اقبال لکھتے ہیں کہ ''میں نے بیماری کے باعث عرصے سے مطالعہ کتب ترک کردیا ہے اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو وہ قرآن مجید ہے یا مثنوی معنوی۔''

جاوید نامہ میں اقبال نے مولوی کو اپنا راہبر بنایا۔ گلشن راز جدید کے علاوہ اقبال کی تمام مثنویاں اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، بندگی نامہ، جاوید نامہ، مثنوی مسافر و پس چہ باید کرد بحر رمل مسدس مجذوب میں لکھی گئی ہیں جو مولانا روم کی پسندیدہ بحر ہے۔ بالِ جبریل کے مشہور منظومے پیر و مرید میں اقبال نے مثنوی کے ۲۸ اشعار نقل کیے ہیں مکالماتی انداز میں حقیقتِ انسان، اکلِ حلال، جہاد، جلوت وخلوت، جبر و قدر، بیداری دل، خودی اور بے خودی جیسے موضوعات کو واضح کیا۔

اگرچہ اقبال اور رومی دو مختلف زمانوں کے شاعر تھے لیکن ان ادوار کے سیاسی، اجتماعی، مذہبی اور فکری حالات یکساں تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں منگولوں کی یورش سے ملت اسلامیہ میں منفی عقاید، خانقاہ نشینی قناعت اور فقر پروان چڑھے جبکہ چودھویں صدی میں مغربی استعمار کے ہاتھوں مسلمان تن آسانی، درویشی، قناعت اور یاس کو اپنائے ہوئے تھے۔ رومی اور اقبال، جستجو، طلب، عظمت و ہمت کے مبلغ تھے انھوں نے اپنے ولولہ انگیز کلام سے قوم کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی اور تن آسانی، بے کاری و رہبانیت کی مذمت کی۔

☆☆☆

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: ''علامہ اقبال کی وابستگی رسولؐ: چند پہلو''، ترجمان القرآن، لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۴۷-۶۰۔

علامہ اقبال کی زندگی، شخصیت، شاعری اور نثر نگاری کا مطالعہ کریں تو نبی اکرمؐ کے ساتھ تعلق خاطر، ایک قلبی و ذہنی وابستگی اور عشق و محبت کا جذبہ مطالعہ اقبال کا ایک نمایاں اور زریں باب نظر آتا ہے۔ ان کی

زندگی کے ہر دور میں عشق رسولؐ ایک زندہ توانا اور انقلاب انگیز جذبے کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اقبال سب سے پہلے انسانیت پر آپؐ کے احسان عظیم کا ذکر کرتے ہیں کہ آپؐ نے اسے لات ومنات اور چوپایوں اور کاہنوں کی عبدیت کے بوجھ سے آزاد کیا اور امرا و سلاطین کی غلامی کے چنگل سے نجات دلائی۔ پھر افرادِ اُمت کی موجودہ حالت زبوں کا ذکر کرتے ہوئے افرادِ اُمت کے مختلف طبقوں کی ذہنی پس ماندگی پر رنج و تاسف کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں حب رسولؐ کا جذبہ چند ظاہری آداب تک محدود ہوکر رہ گیا ہے، لیکن اقبال کی محبت رسولؐ فقط آپ کی زبان کلامی توصیف تحسین تک محدود نہیں وہ محبت رسولؐ کو خدمت رسولؐ اور خدمت رسولؐ کو خدمت دین کے مترادف سمجھتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی باطل کے خلاف سراپا جہاد تھی۔ عصر حاضر میں بھی گوناگوں باطل نظریات اسلام کے راستے کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کے خاتمے کے لیے کاوش ایک طرح سے سنت نبویؐ ہے۔ خود علامہ اقبال اپنے تئیں احیائے اسلام کے لیے کاوش و کوشش کا فریضہ ادا کرنے کی سعی کرتے رہے اور انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے خدمت اسلام اور خدمت رسول میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

محبت رسولؐ کے ضمن میں علامہ اقبال کو اپنی نسبت حجازی بھی بہت عزیز تھی۔ اسی طرح حجازِ مقدس کے سفر اور زیارت روضۂ رسولؐ کی تمنا کا بہ تکرار اظہار ملتا ہے۔ بارہا سفر حجاز کا ارادہ کیا مگر بوجوہ یہ ارادہ بروئے کار نہ آسکا۔ اقبال کا سفر حجاز کا خواب تو شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا اور نہ ان کی میرم در حجاز کی تمنا بروئے کار آسکی۔ لیکن جب وہ اس عالم فانی سے رخصت ہوکر عالم جاودانی کو سدھارے تو وہ عالم گیری مسجد لاہور کے سایۂ دیوار میں سپرد خاک ہوئے۔ جہاں آج تک نماز اور زیارت مسجد کے لیے آنے والے ہزاروں لاکھوں مسلمان ان کے لیے مستقلاً دست بدعا رہتے ہیں۔ یہ رتبہ بلند ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا اور ایسا اعزاز و افتخار عشق رسول کا دعویٰ کرنے والوں میں سے کم ہی لوگوں کے حصے میں آیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر شیر زمان فیروز: ''ھمسانی ہادر اشعار حکیم ناصر خسرو و علامہ اقبال''، دانش، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۳۹-۵۸۔

حکیم ناصر خسرو (۱۰۰۴ء م) پہلے فلسفی اور شاعر تھے جنھوں نے خود شناسی کو موضوع بنایا۔ نو صدیوں بعد علامہ اقبال نے اپنے کلام میں فلسفہ خودی کو بیان کیا۔ ناصر خسرو کے دور میں ایران کی سرزمین غزنویوں اور سلجوقیوں کے زیر تسلط تھی اور عوام الناس سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی حقوق سے محروم تھے اس طرح اقبال کے دور میں برصغیر پر تاج برطانیہ کا قبضہ تھا۔ یہ دونوں شاعر اپنے وطن کے ان حالات سے خوش

نہ تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے کلام میں کیا۔ یہ دونوں شاعر انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے قرآن مجید اور کمالِ انسانیت کی بقا کے لیے علم و حکمت کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ ناصر خسرو بھی اقبال کی طرح خودی کی تکمیل کے لیے اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی کے داعی ہیں۔

واقعہ کربلا، عشقِ رسولؐ، انسان کامل، روحانی استاد، روح، تقلید، تقدیر، ملوکیت کی مذمت اور صلح کل جیسے موضوعات پر ان دونوں شاعروں نے اپنے اپنے دور میں اظہارِ خیال کیا مقالہ نگار نے اشعار کے ذریعے ان مشترکات کو واضح کیا ہے۔

☆☆☆

محمد موسیٰ بھٹو: ''فکر اقبال کا مطالعہ''، بیداری، حیدرآباد، جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۶۴-۷۷۔

درحقیقت یہ مضمون علامہ کے خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے سندھی زبان میں شائع ہونے والے ترجمے کا مقدمہ ہے، جس میں مصنف نے خوب صورتی سے فکر اقبال کا خلاصہ بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ جناب محمد موسیٰ بھٹو صاحب پاکستان کے علمی اور مذہبی حلقوں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال کے فکر و فلسفے کی نوعیت کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ: ''عالم اسلام کے فلسفی اور حکیم کی حیثیت سے اسلام اور دنیا کے مستقبل کے بارے میں علامہ اقبال کے سامنے کئی اہم چیزیں پیش نظر تھیں۔'' انھوں نے ان کی وضاحت بھی کی ہے۔ ریاستی نظام کی تشکیل کے بارے میں اقبال کی رہنمائی، اقبال کی شخصیت کی ہمہ جہتی، مذہب سے خالی فلسفے کے اثرات، فکری جمود اور اجتہاد سے غفلت کے نتائج، مذہب کی اہمیت، انسان کی ابدیت، مطالعہ تاریخ کی اہمیت، مذہب زندگی کی اعلیٰ سطح سے آشنائی کا ذریعہ، مذہب کی تجرباتی اور محسوساتی سائنس، جدید سائنس کی ناکامی، انسان کے باطن میں موجود غیر معمولی قوتوں کی نشاندہی، مذہب کا مقصد، خیر و شر کی باطنی قوتوں کے درمیان تکرار، فلسفہ ادب عالیہ کا ذریعہ اور اس کی حدودِ کار، مندرجہ بالا عناوین کے تحت مختصر اور جامع وضاحتیں درج ہیں۔ یہ تمام عناوین علامہ کے خطبات ہی سے ماخوذ ہیں۔ آخر میں خطبات پر کیے جانے والے اعتراضات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اور مضمون نگار نے اقبال کی شخصیت و فکر کے بارے میں انتہائی معتدلانہ روّیہ اختیار کیا ہے۔

☆☆☆